© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

دوسری قسط

عجمی تصورات کا پہلا دور

فرقہ جہمیہ

اسلام پہلی صدی ہجری کے اواخر تک عجمی تصورات سے محفوظ و مامون رہا۔ دوسری صدی کے آغاز میں ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ) کے زمانہ میں ایک شخص جہم بن صفوان ظاہر ہوا جو ارسطو کے نظریہ ذاتِ باری سے متاثر تھا۔ اور بزعم خویش اللہ کی مکمل تنزیہہ بیان کرتا تھا۔ وہ بھی خدا کے متعلق تجریدی تصور کا حامل تھا۔ اور خدا تعالیٰ کی ان صفات کی نفی کرتا تھا جو قرآن و سنت میں وارد ہیں۔ اس نے تنزیہہ الٰہی میں اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیا کہ بقولِ امام ابوحنیفہ اللہ کو لاشے در معدوم بنا دیا۔ (بخاری کتاب التوحید حاشیہ از وحید الزمان) وہ خدا کے لئے جہت یا سمت متعین کرنے کو شرک قرار دیتا تھا۔ وہ خدا کی طرف ہاتھ، پاؤں، چہرہ، پنڈلی جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ کی نسبت کرنے کا بھی ناجائز قرار دیتا تھا۔ وہ اس آیت:-

ثم استویٰ علی العرش (۵۴/۷) پھر وہ عرش پر جا ٹھہرا۔

یا الرحمٰن علی العرش استویٰ (۲۰/۵) رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا

میں استوٰی کی استولیٰ سے تاویل کرتا تھا۔ امام ابن قیم نے اپنے قصیدہ کونیہ کے درج ذیل شعر میں اسی چیز کی وضاحت فرمائی ہے۔

نون الیھود ولام جھمیّ ھما فی وحی رب العرشِ زائدتان

ترجمہ:- یہودیوں کا "نون" (حِطّۃ[1] کی بجائے حنطۃ کہنا) اور جہمیہ کا "ل" (استوٰی کو استولیٰ کہنا) رب العرش کی وحی سے زائد ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب خود اللہ تعالےٰ نے اپنے لئے تخت پر قرار پکڑنے یا اپنے ہاتھوں، چہرہ، پنڈلی وغیرہ کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے تو اس کی تنزیہہ اس سے

[1] یہودیوں نے حطۃ (بخش دے) کی بجائے حنطۃ (گندم) [illegible] بات کہہ دی جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ بہتر اور کون کر سکتا ہے ؟ رہی یہ بات کہ اس کا عرش کیسا ہے ؟ یا وہ خود کیسا ہے اور کس طرح اس نے عرش پر قرار پکڑا ہے یا اس کا چہرہ اور ہاتھ کیسے ہیں۔ تو ہم یہ جاننے کے مکلف نہیں ہیں۔ کیونکہ اس نے خود ہی فرما دیا ہے کہ لا تضربوا للہ الامثال اور لیس کمثلہ شئ تو بس ایک مسلمان کا ایمان یہ ہونا چاہیئے کہ جو کچھ قرآنِ پاک میں مذکور ہے اسے جوں کا توں تسلیم کرے۔ اُسے عقل اور فلسفہ کی شان پر چڑھا کر اس کی دور از کار تاویلات و تحریفات پیش کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اور نہ ہی قرآن ایسی فلسفیانہ موشگافیوں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں پر یہ قرآن نازل ہوا تھا وہ اُمّی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے قطعاً نابلد تھے۔ پھر یہ قرآن اشاروں اور کنایوں کی زبان میں نہیں اُترا۔ بلکہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ ایسی ٹھیٹھ اور آسان زبان جسے ان پڑھ لوگ بخوبی سمجھ جاتے تھے۔

ارسطو کی تعلیمات کی تائید میں جہم بن صفوان کے لیئے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی سے خوش یا کسی پر ناراض ہو سکتا ہے۔ اور جو آیات مثلاً رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ یا غضب اللہ علیھم وغیرہ قرآنِ پاک میں وارد ہیں ان سب کی دور از کار تاویلات پیش کر کے خدا تعالیٰ کی صفات سے "تنزیہہ" کرتا تھا۔ پھر جو لوگ ان کے ہم خیال پیدا ہوئے اور اس کے نام کی نسبت سے "جہمیہ" کہلائے۔ ذات صفات باری تعالیٰ کے متعلق اختلافات کے علاوہ وہ کئی دوسرے امور میں بھی اہل سنت والجماعۃ سے اختلاف رکھتے تھے لیکن انہیں یہاں زیر بحث لانا مقصود نہیں۔

مسئلہ تقدیر میں یہ لوگ انسان کو مجبور محض سمجھتے تھے۔ وہ انسان کے ارادہ کو من جانب اللہ تصور کرتے تھے۔ دلیل یہ تھی کہ انسان خود مخلوق خدا ہے۔ لہٰذا مخلوق کے ارادہ کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے۔ اسی طرح انسان کے افعال کا خالق بھی خدا ہے۔ انسان کی طرف افعال کی نسبت محض مجازی ہے۔ رہا جزا اور سزا کا مسئلہ تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح جزا اور سزا بھی جبری ہے۔ یعنی جس طرح جبر کی بنا پر انسان اچھے اور بُرے افعال کرتا ہے۔ اسی طرح جبر ہی کی بنا پر اسے جزا اور سزا بھی دیجاتی ہے (مسئلہ جبر و قدر ص ۵۸)

اعتزال (RATIONALISM)

اس زمانہ میں ایک اور شخص واصل بن عطاء (۸۰ ، ۱۳۱ھ) کا ظہور ہوا مشہور یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ واصل بن عطا حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کے درس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا حضرت حسن بصری سے یہ اختلاف ہوا کہ آیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہی رہتا ہے (جیسے مرجئہ کا خیال تھا) یا کافر ہو جاتا ہے۔ (جیسا کہ خوارج کہتے تھے۔) حضرت حسن بصری کا یہ خیال تھا کہ وہ منافق ہوتا ہے۔ واصل بن عطاء نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے ہمنوا ساتھیوں کو لے کر آپ کے حلقہ درس سے اُٹھ کر مسجد کے کسی دوسرے کونے میں الگ جا بیٹھا۔ تو حضرت حسن بصریؒ نے کہا کہ اِعْتَزَلَهٗ مِنَّا یعنی وہ ہم سے کنارہ کر گیا ہے۔

لیکن بات صرف اتنی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ واصل بن عطاء (۸۰ تا ۱۳۱ھ) ایک مکتبِ فکر کا بانی تھا۔ جو بعد میں اعتزال کے نام سے مشہور ہوا۔ ذات باری تعالےٰ کے متعلق اس کے عقائد جہم بن صفوان سے ملتے جلتے تھے۔ یونانی فکر کا رنگ اس پر غالب تھا۔ اور اس کے متعقدین بعد میں معتزلہ کہلائے۔ سیاسی لحاظ سے بھی ان لوگوں کے بعض عقائد اہلسنت والجماعت سے مختلف تھے۔ لیکن انہیں یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

بموجب ہارون الرشید (۱۴۷، ۱۷۰ھ) کے عہد میں یونانی فلسفہ کے تراجم عربی زبان میں شائع ہوئے۔ تو یہ خیالات عام مسلمانوں تک پہنچے۔ تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں دو قسم کے گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جس نے قرآن وسنت کے مقابلہ میں ارسطو کے "نظریات الٰہیہ" کو کلیتاً رد کر دیا۔ دوسرا گروہ ان ذہین فطین لوگوں کا تھا۔ جس نے محض اس بات پر ہی اکتفا نہ کیا کہ یونانی فلسفہ کو رد کو دیا جائے۔ بلکہ انھوں نے عام مسلمانوں کو اس یونانی فلسفہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی خاطر فلسفہ کا جواب عقلی دلائل سے پیش کیا اور علم کلام کی طرح ڈالی۔ ایسے لوگوں میں امام احمد بن حنبل (م ۲۴۰ھ)، امام بخاری (م ۲۵۰)، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے نام سرفہرست ہیں۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ایسی ہی خدمات سرانجام دیں۔

اور تیسرا گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے یونانی افکار و نظریات سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور ان کو من وعن قبول کر لیا۔ اس گروہ کی تخم ریزی تو پہلے ہی واصل بن عطا کر چکے تھے۔ یونانی افکار و نظریات سے تقویت پا کر ایک منظم فرقہ کی حیثیت سے سامنے آتے۔ ان کے مخالفین تو انہیں معتزلین کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ لوگ خود کو "اہل العدل والتوحید" کہتے تھے۔ گویا یہ لقب ان کے نزدیک گویا نظریات کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن سے وہ عام مسلمانوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ ترجمان تھا۔

معتزلہ کے عقائد ونظریات

مسئلہ تقدیر یا جبر وقدر

اہل عدل کے لفظ سے وہ اپنے مخصوص عقیدہ قدر کی وضاحت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں خود مختار ہے۔ باری تعالیٰ بس ان افعال کا خاموش تماشائی ہے۔ اس کی بلند ذات انسان کے معاملات میں دخیل ہونا پسند نہیں کرتی۔ انسان جس طرح اس طبعی دنیا میں قوانینِ طبعیی کا پابند ہے۔ اگر وہ آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو ہاتھ کا جلنا ناگزیر ہے۔ بعینہ اسی طرح اسے اپنے برے اعمال کا عذاب یا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر انسانی اعمال میں اللہ کو دخیل مان لیا جائے تو قیامت کے دن انسان کا محاسبہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسانی اعمال کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ و منشار کے تابع قرار دیا جائے تو پھر انسانوں کو عذاب دینا معاذ اللہ ظلم کا ارتکاب ہے جس سے وہ ذات پاک ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے افعال و اعمال میں پوری طرح خود مختار ہو۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں اگر انسانی اعمال اللہ کی مرضی کے تابع ہوں اور انسان مجبور محض ہو۔ تو پھر اسے انبیاء کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

تقدیر کی بحث

یہ مسئلہ بہت پرانا ہے اس پر کئی طرح بحث ہو چکی ہے اس مسئلہ نے اس دور میں اتنا طول کھینچا کہ دو الگ الگ فرقے "قدریہ" اور "جبریہ" معرضِ وجود میں آگئے۔ دونوں اپنے اپنے دلائل دیتے تھے۔ مگر کوئی دوسرے کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکا۔ حالانکہ یہ مسئلہ اتنا مشکل اور ٹیڑھا نہ تھا۔ جتنا کہ اسے بنا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ عقلی دلائل اور علت ومعلول کی کڑیاں ملانے سے حل ہونے والا نہیں۔ اس کے لئے صرف اپنے دل کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جو بھی ارادہ کریں، اور پھر اس کو کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ کام عموماً ہو جاتا ہے۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ارادہ بھی کرتے ہیں اور اس کے لئے سرتوڑ کوشش بھی، لیکن وہ کام سر انجام نہیں پاتا۔ کیونکہ

لے اسی بنا پر انھوں نے شفاعت کا بھی انکار کر دیا۔ (المعتزلہ تالیف زہدی حسن جار اللہ ص۵۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی اعمال و افعال میں خارجی عوامل یا اتفاقات کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ زلزلے، سیلاب، قحط، بیماری، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ، اکثر انسانوں کی پوری زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے بڑی سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے بنائے تھے۔ اپنی راحت اور کامیابی کیلئے بناکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی اتفاقات انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا ذرہ بھر بھی عمل دخل نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال میں بس ایک حد تک خود مختار ہے مختارِ کل نہیں ہے۔ اب اس اختیار و اضطرار کی حدود مقرر کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ سوال درحقیقت یوں بنتا ہے کہ اس کائنات میں خالقِ کائنات کا دستور اساسی کیا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ بات انسان کی عقل و فہم سے بالاتر ہے۔

افعال کی نسبت

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ انسان کے بعض افعال کی نسبت بعض مقامات پر بندے کی طرف سے اور بعض مقامات پر خدا کی طرف ہے۔ خواہ وہ اچھے ہوں یا برُے ہوں۔ پھر کبھی برُے افعال کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک فعل کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سبب کی طرف نسبت کر دی جاتی ہے۔ تو وہ نسبت ٹھیک ہی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً ایک بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ فوج نے ملک کو فتح کیا، اور یوں بھی کہ فلاں فلاں نامور افراد نے اس ملک کو فتح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب ایک ایسا مربوط سلسلہ ہے کہ اس میں کسی ایک کا حصہ معین نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہٖ یہی صورت حال انسان کے افعال کی ہے۔ اب ان کی مثالیں دیکھئے۔

۱۔ انسان کے اچھے اعمال کی نسبت انسان کی طرف :۔

واما الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فیوفیھم اجورھم (۳/۵۷)

۲۔ انسان کے اچھے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

ان اللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

۳۔ انسان کے برُے اعمال کی نسبت انسان کی طرف،

وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (۴/۷۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ انسان کے برے اعمال کی نسبت شیطان کی طرف :۔

الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء (۲/۲۶۸)

۵۔ انسان کے برے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل اللہ فلن تجدلہ سبیلا (۴/۸۸)

۶۔ اچھے اور برے اعمال کی نسبت انسان کی طرف :۔

الیوم تجزون ما کنتم تعلمون (۴۵/۲۸)

۷۔ اچھے اور برے اعمال کی نسبت خدا کی طرف :۔

واللہ خلقکم وما تعملون و ان تصبھم حسنۃ (۴/۷۸)

چونکہ انسان کے کسی عمل یا فعل میں ان مختلف عوامل کے کارکردگی کے حصے متعین کرنا انسانی عقل کے احاطہ وادراک سے باہر ہے۔ جیسا کہ ہر دور کے علماء اور مفکرین اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے ہیں۔ اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ تقدیر کو زیر بحث لانے اور عقلی دلائل سے حل کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ قضا و قدر کا سوال حقیقت میں یہ سوال ہے کہ خداوند عالم کی سلطنت کا دستور اساسی کیا ہے؟ ایک مرتبہ صحابہؓ آپس میں مسئلہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لائے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا آپؐ نے فرمایا :۔

"کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔"

ایک موقعہ پر آپؐ نے فرمایا :۔

جو شخص تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا قیامت کے دن اس سے سوال کیا جائے گا۔ جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت علیؓ کے مکان پر رات کو تشریف لے گئے اور پوچھا :

"تم لوگ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟" حضرت علیؓ نے جواب دیا :

"یا رسول اللہؐ! ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو ہم اٹھ جائیں گے۔" یہ سن کر حضورؐ فوراً واپس ہو گئے اور اپنی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا :۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"وکان الانسان اکثر شئً جدلاً" (۱۸/۵۴)

"انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔"

اس حدیث سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ انسان عموماً ایسی "جبریت" کا اس وقت سہارا لیتا ہے۔ جب وہ اپنے میں کچھ قصور یا کمی دیکھتا ہے

۲۔ اپنے قصور یا اپنے حصہ کو اعترافات کرنے کے بجائے اسے کسی دوسرے کے سر تھوپنا ہی جھگڑے اور فساد کی بنیاد ہوتی ہے۔

۳۔ حضور نے حضرت علیؓ کے جواب کی تردید نہیں فرمائی۔ بلکہ آپ کی ناراضی کی وجہ یہ تھی کہ جو قوت اختیار و ارادہ اس معاملہ میں حضرت علی کو حاصل تھا۔ اس کی انھوں نے نفی کر دی تھی۔ گویا انسان کے سب افعال میں خدا اور انسان کا اشتراک ہے۔

لیکن افسوس کہ حضور اکرم کے ایسے واضح احکامات کے، باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ وطبیعات کا مطالعہ کرنے سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی داخل ہو گیا۔ اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ مسئلہ اسلامی علم کلام کی مہمات مسائل میں شمار ہونے لگا۔

تاویلات قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جن میں انسان کے مکمل صاحب اختیار ہونے کا پہلو نکلتا ہے اور ان کی تاویلات سے وہ شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو پہلے ہی ایک نظریہ قائم کر چکا ہو لیکن جس شخص کو قرآن کی رہنمائی مقصود ہو وہ ایسے دلائل و تاویلات سے مطمئن ہونے کی بجائے خود قرآن کریم کو ہی متضاد نظریات کا حامل قرار دے کر اس سے بدعقیدہ ہو جائے۔

عدل یا قانون جزا و سزا قانون جزا و سزا یہ ہے کہ انسان اپنے کسی فعل یا عمل میں جس قدر مختار ہوتا ہے اسی حد تک وہ اس کا ذمہ دار ہے اور جہاں سے اضطرار کی کیفیت شروع ہوتی ہے۔ تو اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی شخص اگر آپ کو گالیاں دے تو آپ اس کو جواب میں گالی دیں گے یا پتھر سے یا کم از کم سخت سست ہی کہیں گے۔ لیکن اگر وہی گالی دینے والا شخص دیوانہ ہو تو آپ اسے معذور سمجھیں گے اور اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے دیکھئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درج ذیل آیات کس خوبی سے اس بات کی وضاحت پیش کر رہی ہیں۔

وان لیس للانسان الا ماسعٰی	اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی
وان سعیہ سوف یریٰ۔ ثم	اس نے کوشش کی۔ اور بلاشبہ اس کی کوشش
یجزٰہ الجزاء الاوفیٰ (۵۳/۳۹)	کو دیکھا جائیگا۔ پھر اس کا پورا پورا بدلہ اس
	کو دیا جائے گا۔

یعنی کسی انسان کے عمل میں انسان کا جتنا حصہ ہے اسے دیکھا جائے گا۔ پھر اسے اس کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ نہ کم نہ زیادہ بلکہ اس کا پورا پورا بدلہ۔ یہیں سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو اعمال کی قیمت اس کی جزا کا حساب رکھ سکے۔ اور دوسرا یہ کہ حقیقی عدل کے قیام کے لئے اخروی زندگی اور اس پر ایمان لانا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اگر ایسا حقیقی عدل اسی دنیا میں ہی ملنا شروع ہو جائے تو دنیا سے بس نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے۔ بموجب ارشاد باری تعالےٰ :

ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا	اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کے
ما ترک علیٰ ظہرھا من دابۃ	سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر
(۳۵/۴۵)	کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا ۳۵/۴۵

معتزلہ کی توحید

یا صفات باری تعالیٰ

اور اہل توحید کے لفظ سے وہ اپنے مخصوص عقیدے کی وضاحت کرتے تھے جو ارسطو نے پیش کیا تھا۔ وہ بڑے طمطراق سے یہ دعوے کرتے تھے کہ وہ توحید خالص کے قائل ہیں اور باری تعالےٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ یکتا ہے قدیم ہے۔ اس معاملے میں کوئی دوسری صفت یا چیز اس کی شریک و سہیم نہیں اور اگر اس کی صفات بھی اسی کی طرح ازلی و ابدی مان لی جائیں تو تعدد قدماء لازم آتا ہے۔ جو شرک ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خدا کی صفات مثلاً علم، قدرت، حیات، سمع، و بصر وغیرہ کو اس معنی میں مانتے تھے۔ کہ وہ فی ذاتہٖ قادر، حی، سمیع و بصیر ہے۔ اس کی کوئی صفت اس کی ذات پر الگ سے زائد نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ظاہر ہے کہ خدا کے متعلق ایسے تجریدی تصور کا۔ جس میں خدا کی حیثیت رہتی سے ایک گنبد کی سی رہ جاتی ہے۔ جس کے مطابق ہر سبب لازمی طور پر ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے اور علت و معلول کا یہ بے جان اور ارادہ و اختیار سے یکسر عاری نظام اس کائنات کو میکانکی طور پر چلا رہا ہے ۔۔ اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام میں خدا کی ذات ستودہ صفات ہے۔ جس کی زندگی میں حرارت اور کائنات سے گہری محبت رکھتا ہے۔ جو صاحب ارادہ ہے۔ جو علیم و بصیر ہے اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے نہ صرف اسے وہ اچھی طرح دیکھتا اور جانتا ہے۔ بلکہ اس کی براہ راست نگرانی کر رہا ہے۔ انسان جب تک ایسی حیّ و قیوم ہستی پر ایمان نہیں لاتا اس وقت تک اسے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ ریاضی کے بگے بندھے فارمولوں اور علت و معلول کی بے جان کڑیوں یا مجرد تصور سے اخلاق و روحانیت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ گویا معتزلین نے ایک طرف تو خدا کو معطل بنا دیا اور دوسری طرف انسان کو مکمل خود مختار بنا دیا۔

معتزلہ کے یہ عقائد ہر چند گمراہ کن تھے اور مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو مردود قرار دے دیا تھا۔ تاہم ایک وجہ ایسی پیدا ہو گئی جو معتزلہ کے شہرت دوام کا باعث بن گئی۔ عباسی خلیفہ منصور (۱۳۶۔۱۵۸ھ) واصل بن عطاء سے متاثر تھا۔ اس لئے واصل بن عطاء کو بڑا بلند مرتبہ حاصل تھا۔ تاہم خلیفہ منصور نے یہ خیالات اور عقائد اپنی ذات تک محدود رکھے اور ان کو رعایا پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کی۔ یہ عقائد عباسی خلفاء میں پرورش پاتے رہے۔ ہوتے ہوتے جب مامون الرشید کا دور (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) آیا۔ تو ان عقائد نے سنگین صورت اختیار کر لی کیونکہ مامون خود پکا معتزلی تھا۔ اور اس نے یہ عقائد بہ جبر مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔

مسئلہ خلق قرآن

مشہور مسئلہ خلقِ قرآن اسی کے دور کی پیدائش ہے۔ یہ مسئلہ دراصل معتزلہ کے متعلق تجریدی تصور کا ایک حصہ تھا۔ وہ خدا کی دوسری صفات کی طرح بولنے اور کلام کرنے کی صفت کو بھی حادث سمجھتے تھے۔ لہٰذا قرآن کو قدیم کی بجائے حادث یا مخلوق تسلیم کرنا لازم آتا تھا۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون عام معتزلین سے بھی چار قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ علماء اور جمہور اسلام نے مامون کو بدعتی کہنا شروع کر دیا تھا تو اس سے بھی وہ متشدد ہو گیا۔ اس نے حاکم بغداد اسحاق بن ابراہیم کو فرمان بھیجا ۱۔ جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے ہیں ان کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ ۲۔ ان کی شہادتیں ناقابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتماد قرار دی جائیں اور ۳۔ دارالخلافہ کے ممتاز علماء کے دربارہ خلقِ قرآن قلمبند کر کے میرے پاس بھیجے جائیں۔

چنانچہ حاکم بغداد نے بیس علماء کے بیانات درج کر کے خلیفہ کو بھیجے۔ جن میں سے اکثر علماء نے معتزلی عقائد کی صریحاً نفی کی تھی۔ کچھ نے گول مول جواب دیا۔ مامون ان بیانات پر سخت برہم ہوا۔ اور حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کو مخلوق نہ مانیں انہیں فوراً گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔

۱۔ احمد بن حنبلؒ

یہ فرمانِ شاہی سن کر کم و بیش سب علماء نے اپنی جان بچانے کی خاطر قرآن کو مخلوق کہہ دیا۔ صرف چار علماء امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن نوح، قواریری وغیرہ اپنے اصلی مسلک پر قائم رہے۔ اسحاق حاکم بغداد نے انہیں بوجھل بیڑیاں پہنا کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔

مقام حیرت ہے کہ مامون جیسا عالی ظرف اور متحمل مزاج انسان اس مسئلہ پر اتنا تنگ خیال اور متعصب ثابت ہوا۔ اور ایک فلسفیانہ خیال اور سوال کو مذہبی عقیدہ کا رنگ دے کر خواہ مخواہ امت میں انتشار پیدا کر دیا۔ وہ قرآن کو غیر مخلوق سمجھنے والوں کو مشرک سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے کئی علماء برحق کو اپنے ہاتھ سے اسی مسئلہ کی وجہ سے تہ تیغ کر کے دارالسلطنت کی گلیوں کو رنگین کر دیا۔ جب اسے ان چار آدمیوں کے قافلہ کی روانگی کا علم ہوا۔ تو یک دم جوش و غضب سے بھر گیا۔ وہ اپنی تلوار ہوا میں لہراتا اور قسم کھا کر کہتا تھا کہ میں ان لوگوں کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔

سرکاری خدام میں سے ایک شخص امام احمد بن حنبل کا دل سے معتقد تھا۔ وہ کسی طرح اس قافلے کو جا کر ملا اور امام احمد بن حنبلؒ سے صورتِ حال بیان کی۔ امام صاحب کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ البتہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی، وہ مستجاب ہوئی مامون پر تپ لرزہ کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ ہزار کوشش کے باوجود جانبر نہ ہو سکا۔ یہ قافلہ ابھی راستہ ہی میں مقام رقہ پر پہنچا تھا کہ مامون کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اور یہ لوگ واپس بغداد بھیج دیئے گئے۔

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ (۲۱۸۔ ۲۲۷ھ) تخت نشین ہوا۔ یہ شخص گو علم و ادب سے بیگانہ تھا، مگر معتزلی عقائد میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اس کے عہد کا افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ اس نے کئی بار امام صاحب کو کوڑوں سے پٹوایا، عموماً روزانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دس کوڑوں کی سزا دی جاتی ۔ اس سے بعض دفعہ امام صاحب بے ہوش بھی ہو جاتے ۔ انہی دنوں کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک ڈاکو ابو الہیثم نے بڑی کوشش سے امام احمد سے تنہائی میں ملاقات کی اور آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ یقین ہے کہ آپ حق پر ہیں۔ آپ نے فرمایا: "میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں حق پر ہوں" ابو الہیثم کہنے لگا۔ مجھے دیکھئے! ساری عمر ڈاکہ زنی میں گزری کئی ڈاکے ڈال چکا ہوں اور کئی مرتبہ گرفتار ہوا۔ آج تک اٹھارہ سو کوڑے کھا چکا ہوں ۔ لیکن کبھی اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا ۔ آپ حق پر ہیں ۔ لہذا کوڑوں کے ڈر سے آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنی چاہیئے" امام صاحب زندگی بھر اس ڈاکو کو دعائیں دیتے رہے ، جس نے ایسے نازک وقت میں ان کے پائے ثبات کو مزید استحکام بخشا۔

امام صاحبؒ کی سزا اور موت کا مسئلہ دراصل ان کی ذات تک محدود نہ رہا تھا۔ عوام الناس کو امام موصوف سے گہری عقیدت تھی ۔ لہذا حکومت انہیں قتل کر کے بغاوت کا خطرہ مول نہ لے سکتی تھی ۔ اور سزا کو قید خانہ اور کوڑوں تک محدود رکھتی تھی ۔ مشہور سرکاری اور معتزل عالم احمد بن ابی داؤد کے امام موصوف سے مناظرے بھی کرائے جاتے ۔ اور جب ابن ابی داؤد امام صاحب کے دلائل سے لاجواب ہو جاتا تو بالآخر یہ کہہ کر خلیفہ کو ابھارتا تھا کہ یہ شخص سخت بدعتی اور ہٹ دھرم ہے ۔ ادھر عوام الناس کی نظریں امام احمد پر جمی ہوئی تھیں ۔ اگر امام صاحبؒ اس مسئلہ میں تھوڑی سی بھی لچک پیدا کر لیتے تو لوگوں کی عام گمراہی کا بھی خطرہ تھا۔ لہذا وہ کوڑے کھاتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" گویا یہ مسئلہ اب امام صاحب کی زندگی اور موت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ تمام امت کی ہدایت وضلالت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ اگر اس موقعہ پر امام صاحب ہار تسلیم کر لیتے تو اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ حکومت وقت عقائد اور دینی امور میں تغیر و تبدل کا حق رکھتی ہے ۔ اور یہ بات امام صاحب کو قطعاً گوارا نہ تھی ۔ نہ ہی اُمت کا اجتماعی ضمیر اس کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ صراحتاً نہیں تو باتوں باتوں میں لوگ خلیفہ تک اپنے خیالات کا اظہار کر بھی دیتے تھے ۔

معتصم کے بعد اس کا بیٹا واثق باللہ (۲۲۷-۲۳۲) تخت و تاج کا وارث بنا یہ معتزلہ عقائد کی اشاعت میں اپنے باپ سے بھی بڑھ گیا۔ اس کے دور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دربار کا خاص مسخرا ایک دن خلیفہ کے سامنے آیا تو کہنے لگا: "اللہ تعالیٰ امیرالمومنین کو قرآن کے بارے میں صبر جمیل کی توفیق بخشے۔"

واثق: "خدا تجھے سمجھے! نالائق کیا قرآن کی وفات ہوگئی؟"

مسخرا: "امیرالمومنین! آخر کیا چارہ ہے ہر مخلوق پر موت واقع ہونے والی ہے، اور قرآن بھی مخلوق ہے۔ آج نہیں تو کل یہ حادثہ ہو کر رہے گا۔"

مسخرے کے اس جواب پر واثق سوچ میں ڈوب گیا تو مسخرے نے دوسرا سوال کر دیا اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

امیرالمومنین! آئندہ لوگ نماز تراویح میں کیا پڑھا کریں گے؟ واثق باللہ کو مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہ اس مسئلہ پر متشدد نہ رہا تھا۔ اور اپنے طور پر لاادریت کے مقام پر آگیا تھا۔ کہ انھی دنوں ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔ ایک نامعلوم بزرگ آیا اور اس نے خلیفہ سے اس مسئلہ پر ابن ابی داؤد سے مناظرہ اور بحث کرنے کی اجازت طلب کی۔

خلیفہ نے اجازت دے دی تو اس سفید ریش بزرگ نے ابن ابی داؤد سے کہا:

"میں ایک سادہ سی بات کہتا ہوں، جس بات کی طرف نہ خدا کے رسول نے دعوت دی نہ ہی حضرت ابوبکرؓ نے۔ نہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ نے۔ تم اس کی طرف لوگوں کو لاتے ہو اور پھر منوانے کے لئے زبردستی سے کام لیتے ہو۔ اب اب دو ہی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان جلیل القدر ہستیوں کو اس مسئلہ کا علم تھا لیکن۔ انھوں نے سکوت فرمایا تو تمھیں بھی سکوت اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اگر تم کہو کہ ان کو علم نہ تھا تو اے گستاخ ابن گستاخ! ذرا سوچ جس بات کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا، اس کا علم تمھیں کیسے ہو گیا؟"

ابن ابی داؤد سے اس کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ واثق باللہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ زبان سے باربار یہ فقرہ دہراتا تھا "جس بات کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا، اس کا علم تجھے کیسے ہو گیا؟ مجلس برخاست کر دی گئی۔ اس نے اس بزرگ کو عزت و احترام سے رخصت کیا اور اس کے بعد حضرت امام پر سختیاں بند کر دیں۔

غرض اسی واقعہ ... ابن ابی داؤد لوگوں کی نظروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں گر گیا۔ پھر جب واثق باللہ کے بعد اس کا بھائی متوکل باللہ (۲۳۲ھ۔ ۲۴۶ھ) تخت نشین ہوا تو اس نے باعزت طور پر رہا کر دیا۔ یہ معتزلہ عقائد سے بیزار اور متبع سنت خلیفہ تھا۔ اس طرح اعتزال سے جب حکومت کی پشت پناہی ختم ہوئی۔ جو اس کا آخری سہارا تھا۔ تو یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔

● تبلیغی اجتماعات کے اشتہارات ● قطعات
● دینی کتب ورسائل ● اور ہر قسم کی آفسٹ
● رنگین معیاری طباعت کیلئے

فالکن پرنٹنگ پریس

مینجر۔ فالکن پرنٹنگ پریس عقب پولیس چوکی۔ اردو بازار لاہور

© rasailojaraid.com